مسلم پرسنل لا

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ
سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

فہرست عنوانات

دو باتیں ۵
پیش لفظ ۶
مسلم پرسنل لا کی مراد ۸
مسلم پرسنل لا انگریزوں کے عہد میں ۱۰
مسلم پرسنل لا موجودہ دستور ہند میں ۱۳
تبدیلی کا مطالبہ کیوں؟ ۱۴
قرآن مجید کی رہنمائی ۱۵
حضور ﷺ کا فرمان ۱۷
شریعت میں من مانے قوانین کی گنجائش نہیں ۱۸
زمانہ کے تغیرات اور شرعی احکام ۱۹
نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا ۲۱
سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا طرز عمل ۲۲
سیدنا عمر بن الخطابؓ کا طرز عمل ۲۳
آثارِ صحابہؓ اور ائمۂ مجتہدین کے فیصلے ۲۷

ائمۂ کرام کے فتاویٰ میں تجربہ کا اثر - چند مثالیں	۲۹
نئے عہد میں مسائل کے حل کی راہ	۳۸
اجتہاد	۴۳
موجودہ دور میں اجتہاد کی عملی شکل	۴۴
اجتماعی طریقۂ اجتہاد کوئی نئی چیز نہیں	۴۵
خلاصۂ بحث	۴۸

دو باتیں

''مسلم پرسنل لا'' قانون شریعت کا اہم حصہ ہے، قانون شریعت کا تحفظ اور مسلمانوں کی زندگی میں اس کا نفاذ اسلام کا مطالبہ ہے۔ ''مسلم پرسنل لا'' کیا ہے؟ اس کو جاننے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ قیمتی رسالہ بیحد اہم اور ضروری ہے۔

کچھ دنوں پہلے یہ رسالہ شائع ہوا اور قلیل عرصہ میں ختم ہو گیا، اہل علم اور دانشوروں نے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، لوگوں کا شدید مطالبہ ہو رہا تھا اسے دوبارہ شائع کیا جائے، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اس کی افادیت واہمیت کے پیش نظر پھر اسے شائع کر رہا ہے۔(۱) اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو سمجھنے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی مسلمانوں کو توفیق بخشے۔ آمین!

عبدالستار یوسف شیخ

سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

---

(۱) رسالہ کی اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اب اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ رہ رہ کر سیاسی رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کی زبان پر آتا ہے اور یہ آواز بلند کی جاتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی جائے، علماء کرام اور مسلم رہنماؤں نے اجتماعی اور انفرادی طریقہ پر بارہا یہ بات واضح کردی ہے کہ مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور سماجی زندگی سے مسلم پرسنل لا کا رشتہ نہایت گہرا ہے اس لئے حکومت کی طرف سے کی گئی کوئی تبدیلی مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ پر صرف علمائے کرام غور وفکر کرسکتے ہیں۔

اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس مسئلہ میں براہِ راست مداخلت نہیں کرنا چاہتی اس کی خواہش ہے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی خود مسلمانوں کے مطالبہ کے نتیجہ میں ہو—— ادھر کچھ عرصہ سے چند مسلمانوں نے نام نہاد ترقی پسندی کے نام پر پرسنل لا میں تبدیلی کا مطالبہ شروع کردیا ہے۔ اور مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے اجتماع کرکے حکومت سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی لائے اور مسلم معاشرہ کو ’’اس بندھن‘‘ سے آزاد کرایا جائے۔

اس مرحلہ میں ضرورت ہے کہ مسلمان مسلم پرسنل لا کے متعلق صحیح صورت حال سے واقف ہوں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ یہ جان لیں کہ مسلم پرسنل لا کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا رہی ہے؟ دستورِ ہند میں اسے کیا حیثیت دی گئی ہے؟ اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ حکومت یا نام نہاد ترقی پسندوں کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کا حق ہے یا نہیں؟—— تاکہ آنے والے دنوں میں وہ پوری واقفیت اور ذہنی تیاری کے ساتھ نام نہاد ترقی پسندوں کی یورش اور حکومت کے ارادوں کا مقابلہ اور علماء کرام کے اقدام کی تائید کرسکیں۔

پیش نظر رسالہ ’’مسلم پرسنل لا‘‘ اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اس رسالہ میں مسلم پرسنل لا کا مفہوم، اس کی تاریخ اور دینی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا شریعت اسلامیہ کا ایک حصہ ہے۔ شریعت اسلامیہ میں تبدیلی کا حق حکومت کو حاصل نہیں ہے۔ زمانہ کے انقلابات اور تہذیب ورواج کی تبدیلی کی وجہ سے جو نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں، ان پر غور وفکر اور ان کے دینی حل پیش کرنے کی ذمہ داری اہل علم اور علماء کرام کی ہے۔

یہ مقالہ اسلامک اسٹڈیز سرکل علیگڈھ کی دعوت پر حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ نے لکھا اور مسلم پرسنل لا پر منعقد کئے گئے سمینار (مؤرخہ ۱۴؍، ۱۵؍ستمبر ۱۹۶۹ء) میں پڑھا تھا، اسے حاضرین، اہل علم اور علماء کرام نے پسند کیا تھا اور مختلف اردو اور عربی اخبارات ورسائل میں شائع ہوا تھا۔

حالانکہ اس پر مدت گزر چکی ہے، لیکن بدقسمتی سے اب تک مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ پر بحث جاری ہے اور مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخصات سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لئے یہ مقالہ کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ اس اہم دینی مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم اور مسلمان ’’مسلم پرسنل لا‘‘ کا ذوق وشوق سے مطالعہ کریں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم نہ صرف یہ اہم رسالہ پیش کررہے ہیں بلکہ اسی سلسلہ میں حضرت امیر شریعتؒ کا ایک دوسرا رسالہ بھی شائع ہوکر اہل علم کے درمیان پذیرائی حاصل کرچکا ہے جس کا عنوان ہے ’’قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل‘‘ خدا اِن کوششوں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

اللہ تعالیٰ ہمیں ان قیمتی تحریروں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(مولانا) سید نظام الدین

جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

۲؍مارچ ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وحده لا شريك لهٗ، والصلاة والسلام على محمد لا نبى بعدهٗ۔

مسلم پرسنل لا کی مراد

مسلم پرسنل لا یعنی مسلمانوں کا شخصی قانون جب ہم اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو ہماری اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ وہ ایک مکمل قانون شریعت جو قرآن وسنت، اجماع اور اجتہاد ائمہ سے ثابت ہے یا وہ مخصوص قانون جس کو انڈین شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ میں ''مسلم پرسنل لا'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ اسلام نے اپنے تمام متبعین کی پوری زندگی کو اللہ کے حکم کے تحت قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے انسانی زندگی کے مختلف النوع مسائل کے بارے میں احکام نازل ہوئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتیں دیں یا صحابہؓ نے نئے پیش آمدہ مسائل و حالات پر باہمی مشورہ سے کوئی فیصلہ کیا یا ائمہ مجتہدین نے اشباہ و نظائر، کلیات و اصول کی روشنی میں احکام مستنبط کئے اور ان تمام احکام کے مجموعہ کا نام شریعت اسلامی قرار پایا۔

جب خلافت راشدہ کے عہد میں اور اس کے بعد فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور تمدنی ضرورتیں بڑھیں تو وہاں بھی شریعت کے مقررہ اصول کو سامنے رکھ کر احکام

مستنبط کئے گئے۔

جب آہستہ آہستہ حکومتوں میں شخصی رجحانات کا غلبہ بڑھتا گیا تو ان حکومتوں کو اپنی خواہشات نفس کی تکمیل، اپنے سیاسی اقتدار کے تحفظ اور برتری قائم رکھنے کی فکر نے اسلام کے اجتماعی احکام کو تدریجاً معطل کرنے پر مجبور کردیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے ان کے معاشرتی قوانین قائم رکھے گئے۔ اس طرح وہ اسلام جس کے احکام شخصی اور اجتماعی زندگی میں، سیاست اہلی نیز سیاست مدنی میں ایک درجہ پر قابل اتباع تھے تفریق کا شکار ہوگیا۔ جب یورپ سے اقتدار کا طوفان اٹھا تو اس نے مسلم ممالک میں یہی حربہ استعمال کیا۔ اور قانون اہلی کو قائم رکھا۔ اور اجتماعی مسائل میں رومن لا نافذ کیا گیا آج یورپ کے اقتدار سے آزادی کے بعد جو حکومتیں مسلم ممالک میں قائم ہیں وہاں اب تک پہلا ہی قانون تھوڑی سی ترمیمات کے ساتھ نافذ ہے اور ان ممالک میں اقتدار کی کلید جن ہاتھوں میں ہے وہ اپنے رجحانات، افکار اور خیالات کے اعتبار سے پوری طرح یورپ کے دریوزہ گر ہیں اور اس کے صحیح وارث و جانشیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ اب مسلمانوں کے قانون اہلی میں بھی ایسی ترمیمات کے دروازے کھولے جارہے ہیں جو یا نصوص شرعیہ کے معارض ہیں یا ان کے پیچھے کتاب وسنت کے قائم کردہ اصول کی کوئی سند نہیں، ایسے حالات میں ان مسلم ممالک میں کی جانے والی قانونی تبدیلیاں ہمارے لئے حجت نہیں اور نہ بلاغور وفکر قابل قبول۔

مسلم پرسنل لا انگریزوں کے عہد میں

ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ اور اقتدار ہوا تو قانون اسلامی کو اس کی محدود شکل میں جاری رکھا گیا اور فیصلے کے لئے نظام قضاء باقی رکھا گیا۔ بعد کو یہ مسائل بھی عام عدالتوں کے حوالہ کردئے گئے لیکن مسلمانوں کے معاملات میں قانون شریعت کو جاری اور باقی رکھا گیا۔ انڈین شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ میں اس کی تصریح کردی گئی کہ:

شریعت ایکٹ کے نفاذ کے بعد کوئی دوسرا رواج یا دستور جو اس وقت تک عمل میں رہا ہو۔ شریعت کے خلاف ان معاملات میں جو مسلم پرسنل لا کے مطابق مسلمانوں میں نافذ کئے جانے چاہئیں، لاگو نہیں ہوگا۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کردیا گیا کہ اگرچہ مسلم پرسنل لا اپنے عمومی مفہوم کے اعتبار سے ہر معاملہ میں وہی ہے جس کا قرآن میں اجمالی تذکرہ ہے اور جس کی وضاحت احادیث کرتی ہیں۔ یا جن کے فیصلے اجماع اور قیاس سے ائمہ اربعہ نے کئے ہیں۔ یا شیعہ حضرات کے نقطۂ نظر سے ان کے ائمہ مطہرین نے کئے ہیں مگر یہ وسیع مفہوم ہندوستان میں نہیں لیا گیا۔ بلکہ مسلم پرسنل لا کو وراثت، نکاح، خلع، (طلاق) ایلاء، ظہار، فسخ نکاح، نفقہ، مہر، حضانت، اوقاف میں محدود کردیا گیا۔ چنانچہ محمڈن لا مصنفہ بابو رام ورما (تیسرا ایڈیشن) کی پہلی دفعہ حسب ذیل ہے:

دفعہ ۱:

''ہندوستان میں محمڈن لا صرف ان ہی معاملات میں مسلمانوں پر نافذ ہوگا

جن کے لئے دستور ہند کے آرٹیکل نمبر ۲۲۵ میں کہا گیا ہے یا ان معاملات میں جن کے بارے میں کسی قانون کے ذریعہ ہدایت کی گئی ہے یا اجازت دی گئی ہے''۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۳۲۳ کہتی ہے کہ:

''جب فریقین ایک ہی پرسنل لا کے ماتحت ہوں تو وراثت اور معاہدہ کے مقدمہ میں ان کی شنوائی ان کے پرسنل لا کے مطابق ہوگی۔ اور فریقین کے پرسنل لا مختلف ہوں تو مقدمہ کا فیصلہ مدعاعلیہ کے پرسنل لا کے مطابق ہوگا۔''

اس طور پر غیر مسلموں کو ان کے مدعاعلیہم رہنے کی حالت میں ان معاملات میں قانونِ شریعت سے بری کردیا گیا۔ اس دفعہ میں یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ یہ حقوق قانون سے بدلے بھی جاسکتے ہیں۔ چنانچہ قانون معاہدہ (Indian Contract Act) نے معاہدات کو مسلم پرسنل لا سے خارج کردیا اور اب معاہدات میں خواہ فریقین مسلم ہی کیوں نہ ہوں انڈین کنٹریکٹ ایکٹ ہی نافذ کیا جائے گا اسی طرح انڈین انٹرسٹ ایکٹ (Indian Interest Act) کے ذریعہ سودی لین دین کو مسلم پرسنل لا کی حدود سے باہر کردیا گیا۔

ابتداءً مسلم پرسنل لا کا تصور بہت مبہم تھا۔ بنگال آگرہ، آسام سول کورٹس ایکٹ ۱۸۸۷ء میں کہا گیا کہ:

''کسی متضاد قانون کی غیر موجودگی کی صورت میں وراثت، نکاح، شادی

کے تمام معاملات محمڈن لا کے مطابق فیصل ہوں گے۔ بشرطیکہ فریقین مسلمان ہوں''۔

ظاہر ہے کہ یہ مبہم تصور انتشار کا باعث بنا اور مختلف ہائی کورٹس نے مختلف رائیں ظاہر کیں۔ اسی لئے انڈین شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء لایا گیا جس کی رو سے یہ واضح ہوگیا کہ مسلم پرسنل لا کی حدود میں صرف وراثت، نکاح، خلع، فسخ، طلاق، ایلاء، ظہار، مبارات، حق شفعہ، خوراک و پوشاک، مہر، حضانت، ہبہ اور اوقاف شامل ہیں۔ اسی لئے ثبوت نسب کے احکام قانون شریعت کے تحت داخل نہیں رہے بلکہ قانون شہادت کے مطابق قرار دئے گئے۔ چنانچہ قانون شہادت کی دفعہ ۱۱۲ کی رو سے اگر شوہر کے انتقال کے ۲۸۰ دنوں بعد کوئی بچہ پیدا ہوا تو وہ ثابت النسب نہیں ہوگا۔ حالانکہ فقہ حنفی کی رو سے حمل کی اکثر مدت دو برس ہے اس لئے بعد وفات شوہر کسی عورت کے اگر دو برس کے اندر کوئی بچہ پیدا ہوتو اس کا نسب شوہر متوفی سے ثابت تسلیم کیا جائے گا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ضمیمہ ۷ میں مسلم پرسنل لا کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں بلوغ وعدم بلوغ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ دستور ہند کی دفعہ ۲۲۵ ان تمام قوانین کو نافذ قرار دیتی ہے جو دستور کے نفاذ سے پہلے سے نافذ چلے آرہے ہیں۔ نتیجۃً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور انڈین شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء اب بھی مسلمانوں پر نافذ ہیں اور اس وقت تک نافذ تصور کئے جائیں گے جب تک صوبائی دستور ساز اسمبلیاں یا پارلیمنٹ اپنے حدود اختیارات کے اندر ان میں سے کسی دفعہ کو رد نہ کردے۔

مسلم پرسنل لا موجودہ دستور ہند میں

موجودہ دستور ہند میں کچھ ہدایاتی دفعات بھی ہیں جن میں دفعہ ۴۴ میں مرقوم ہے کہ:

''حکومت کو چاہئے کہ سارے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ کوڈ نافذ کرے۔''

اس ہدایاتی دفعہ کا تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام شہریوں کے لئے یکساں سول قانون بنایا جائے۔ اور مسلمانوں کو یا کسی اور طبقہ کو اس بارے میں جو اختصاصات حاصل ہیں اسے ختم کردیا جائے۔

اس دفعہ کا پس منظر یہ ہے کہ جو لوگ متحدہ قومیت کے تصور کے لئے مذہبی معاشرتی اور ثقافتی وحدت بھی ضروری سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ایک قوم کے افراد کے درمیان ایک زبان، ایک رسم الخط، ایک قانون وراثت، اور ایک ہی قسم کا معاشرتی اور تہذیبی نظام جاری رہنا چاہئے تاکہ قوم کے تمام ہی افراد کے درمیان پوری طرح یکسانی پیدا ہوجائے اور ملی امتیازات قائم نہ رہیں۔ اس کے برعکس دستور کی دفعہ ۲۹ جو بنیادی حقوق سے متعلق ہے وہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اکائیوں کے لئے علیحدہ زبان، الگ رسم الخط اور علیحدہ تہذیب وتمدن کی بقاء وتحفظ کی ضمانت دیتی ہے اور جب دستور کی ان دو دفعات یعنی دفعہ ۴۴ (ہدایاتی) اور دفعہ ۲۹ (بنیادی حقوق) کے درمیان تعارض پیدا ہورہا ہے تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہدایاتی دفعہ کے ذریعہ دستور کے دئے ہوئے بنیادی حقوق شہریوں سے چھینے نہیں جاسکتے اس لئے دفعہ ۴۴ پر کوئی عمل اس

وقت تک ممکن نہیں جب تک دستور میں دفعہ ۲۹ موجود ہے۔ الّا یہ کہ دستور ہند کی دفعہ ۲۹ ہی میں ترمیم کردی جائے یا اسے ختم کردیا جائے۔

تبدیلی کا مطالبہ کیوں؟

مسئلہ کی مذکور الصدر قانونی حیثیت کے جان لینے کے بعد خود بخود یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا جو مسئلہ حکومت کے بعض ذمہ داروں یا کچھ سیاسی لیڈروں کی طرف سے بار بار اٹھایا جارہا ہے اس کا پس منظر اور داعیہ یہ نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لا اور شریعت ایکٹ کے تحت نافذ قانون میں سے کسی خاص قانون کے برتنے سے کوئی حرج یا مسلمانوں کے معاشرے میں کچھ مشکلات محسوس کی جارہی ہیں۔ اس لئے ایسا سوچا جارہا ہو کہ ان میں ترمیم کردی جائے۔ بلکہ اصل مقصود دستور میں دیئے گئے بنیادی حق (مذہبی اور ثقافتی آزادی) کو ختم کرنا اور ملی امتیازات کو مٹا کر پورے معاشرے میں یکسانیت پیدا کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان جو اپنے عقیدے کے مطابق کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کو ہی واجب الاتباع سمجھتے ہیں اور بحالات موجودہ کم از کم جن چند مسائل کے اندر انہیں اپنی شریعت کے مطابق عمل کی آزادی حاصل ہے اسے بھی ختم کرکے عام انسانی خواہشات کی اتباع اور انسانوں کے بنائے ہوئے اصول اور قوانین کی بالاتری تسلیم کرلینے پر انہیں مجبور کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جاسکتی۔

قرآن مجید کی رہنمائی

قرآن مجید کا مطالعہ اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ راہیں صرف دو ہیں یا تو شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اتباع، یا اپنی خواہشات کی پیروی۔

اول الذکر ہدایت ہے اور آخر الذکر ضلالت وگمراہی۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری راہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فان لم يستجيبوا لك فاعلم انما يتبعون اهوائهم ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدى من الله ان الله لا يهدى القوم الظالمين (قصص:۵۰)

پھر اگر وہ آپ کے کہنے پر عمل نہ کریں تو آپ سمجھ لیں کہ وہ محض اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوسکتا ہے جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی اتباع کرے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب حضرت داؤدؑ کو خلافت ارضی بخشی تو یہ حکم دیا کہ آپ فیصلہ ''حق''، یعنی وحی کی روشنی میں کیجئے اور ''ہویٰ''، یعنی مخالفت وحی کی پیروی نہ کیجئے۔

يا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق ولاتتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله ان الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب (ص: ۲۶)

اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں نائب بنایا۔ پس تم حکومت کرو لوگوں پر

انصاف سے اور خواہشات کی اتباع نہ کرو۔ ورنہ وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گا۔ یقیناً جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اس سبب سے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔

اسی طرح ایک تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو راہیں بتائیں ایک تو اس کی نازل کردہ شریعت کی راہ ہے۔ جو بذریعہ وحی نبی ﷺ تک پہونچی۔ اور دوسری صورت ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہے جو وحی الٰہی پر یقین نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور ان کی امت کو اپنی نازل کی ہوئی شریعت پر چلنے کا حکم دیا اور خواہشات پر چلنے سے منع فرمایا۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها و لا تتبع اهواء الذين لا يعلمون انهم لن يغنوا عنك من الله شيئاً (جاثيه:۱۸)

پھر ہم نے تجھ کو دین کے کام کے ایک راستہ پر رکھا۔ سو تو اسی پر چل اور نادانوں کی خواہشات کی اتباع نہ کر۔ وہ ہرگز اللہ کے مقابلہ میں تجھے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ آپ کے رب کی طرف سے جو شریعت آپ پر اتاری گئی ہے آپ اس پر عمل کیجئے، اس سے گریز اللہ کو چھوڑ کر دوسری ''اولیاء'' کی پیروی کے مرادف ہے۔

اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم و لا تتبعوا من دونه اولياء قليلاً ما تذكرون (اعراف:۳)

اسی پر چلو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اترا ہے۔ اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے، تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔

اسی طرح ایک اور روایت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا اور نزاعات کی شکل میں اللہ و رسول کی طرف لوٹنے کا حکم دیا گیا اور اسے تقاضائے ایمانی قرار دیا گیا، ارشاد ہوا

يا ايها الذين آمنو اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و اولى الامر منكم فان تنازعتم فى شىء فردوه الى الله والرسول ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير و احسن تأويلا (نساء:۵۹)

اے مومنو! اطاعت کرو اللہ کی، اور حکم مانو رسول کا، اور ان کا جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔ یہی بات بہتر ہے، اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھی ہے۔

اسی طرح قرآن نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ اور رسول کے کسی فیصلہ کے بعد مومن کو آگے کوئی دوسرا اختیار باقی نہیں رہتا۔

وما كان لمؤمن و لا مومنة اذا قضى الله و رسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم۔ (احزاب:۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی کام کو طے کر دے، تو ان کو ان کے کام میں اختیار باقی رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کا سب سے بڑا فتنہ ان

لوگوں کو قرار دیا جو وحی الٰہی سے نظر پھیر کر اپنی رائے اور خواہشات کی بنیاد پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے رہتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا:

تفترق امتی علی بضع و سبعين فرقة اعظمها فتنة قوم يقيسون الذين برايهم يحرمون به ما احل الله و يحلون ما حرم الله۔

(اعلام الموقعين برواية عوف ابن مالك اشجعى، ص۵۳ جلد ۱)

میری امت ستر سے اوپر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سب سے بڑے فتنہ والے وہ لوگ ہوں گے جو دین میں اپنی رائے سے قیاس کریں گے، اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیں گے، اور حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرائیں گے۔

شریعت میں من مانے قوانین کی گنجائش نہیں

اس طرح قرآن کریم کی آیات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس پر شاہد ہیں کہ بحیثیت مسلمان ہمارے لئے شریعت سے گریز اور روگردانی کرکے اپنے من مانے قوانین کی اتباع کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، چاہے سیکولرازم اور متحدہ قومیت کے تقاضے جو کچھ بھی ہوں، اور میں نہیں سمجھتا کہ عقیدہ اور فکر کی آزادی، زبان اور رسم الخط کے تحفظ اور مذہب وثقافت کی آزادی کے بلند بانگ دعووں کے بعد تہذیبوں، زبانوں، عقیدوں اور مذہبی تعلیمات کو فنا کرنے کا جواز کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے۔

زمانہ کے تغیرات اور شرعی احکام

رہا دوسرا سوال اور وہ یہ کہ عصری رجحانات اور زمانے کے تغیرات اور سیاسی و سماجی انقلابات کے نتیجے میں احکام شرع کے اندر تبدیلی کی کوئی گنجائش ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو اس کے لئے طریقۂ کار کیا ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اولاً تو اس بات کو پوری طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصول قرآن وسنت کے قائم کردہ حدود کو توڑ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے گی وہ دین سے روگردانی اور گمراہی کی راہ ہوگی، علامہ ابن قیمؒ نے رائے کی تین قسمیں بتائی ہیں:

رای باطل بلاريب، و رای صحيح، و رأی هو موضع الاشتباه (ج۱، ص ٦٧)

بلاشبہ باطل رائے۔ صحیح رائے۔ اور ایسی رائے جس میں تردد ہو۔

رائے باطل کی انہوں نے چند قسمیں کی ہیں اور فرماتے ہیں:

احدها الرای المخالف للنص و هذا مما يعلم بالاضطرار من دين الاسلام فساده و بطلانه و لا تحل الفتيا به و لا القضاء وان وقع فيه من وقع بنوع تاويل و تقليد (ج ۱ ص ٦٧)

پہلی وہ رائے جو نص کے مخالف ہو اور اس کا فساد و بطلان بالکل واضح ہے، اس سے فتویٰ دینا درست ہے اور نہ فیصلہ کرنا، اگرچہ کوئی اسے کسی بھی قسم کی تاویل وتقلید کے سبب کیوں نہ اختیار کرے۔

اسی طرح رائے باطل کی چند اور صورتوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اصولی بات یہ فرمائی ہے کہ رائے کو وحی پر مقدم کر دینا اور خواہشِ نفس کو عقل پر مقدم کر دینا یہی سارے بگاڑ کی جڑ ہے۔

وكل من له مسكة عن عقل يعلم ان فساد العالم و خرابه انما نشأ من تقديم الرائ على الوحى و الهوىٰ على العقل۔ (ج ۱، ص۶۸)

اور جسے بھی کچھ عقل ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی بربادی اور اس کا بگاڑ صرف رائے کو وحی پر، اور خواہشات کو عقل پر مقدم کرنے اور ترجیح دینے کے سبب پیدا ہوا۔

اور آگے یہ فرماتے ہیں کہ جہاں یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ وحی پر رائے اور عقل پر خواہش نفس مقدم کر دی جائے تو حق کی جگہ باطل اور ہدایت کی جگہ گمراہی پیدا ہوگی۔

وما استحكم هذان الاصلان الفاسد ان في قلب الا استحكم هلاكه وفي امة الا فسد امرها اتم فساد، فلا اله الا اللّٰه كم نفى بهذه الآراه من حق، و اثبت بها من باطل، و اميت بها من هدى، واحيى بها من ضلالة، وكم هدم بها من معقل الايمان، و عمر بها من دين الشيطان (اعلام الموقعين ج۱، ص ۶۹-۶۸)

اور جب یہ دونوں فاسد بنیادیں کسی دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں، تو اس

دل کی ہلاکت بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی قوم میں یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا معاملہ بھی پوری طرح تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے، پس خدا شاہد ہے کہ اس قسم کی غلط آراء سے کتنے ہی حق مٹ چکے ہیں اور کتنے ہی باطل وجود میں آئے ہیں۔ اور اسی قسم کی آراء سے بہت سی ہدایتیں دفن کی گئی ہیں، اور گمراہیوں کو زندگی ملی ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اس قسم کی آراء ایمان کے قلعوں کو منہدم کرنے اور شیطان کے طریقہ کو آباد کرنے کا ذریعہ بنی ہیں۔

اس لئے دین کے بارے میں نصوص شرعیہ سے آزاد ہو کر قواعد شرع کو نظر انداز کر کے کوئی راہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے مقاصد فوت ہو جائیں گے اور دین اور احکام الٰہی سے بغاوت کی راہ کھل جائے گی۔

بہر حال جس طرح یہ ایک عظیم الشان غلطی ہے اسی طرح عصری رجحانات، زمانے اور حالات کے تغیر اور ضرورت وحرج کو نظر انداز کر دینا بھی کچھ کم غلط نہ ہوگا، اس لئے کہ شریعت اسلامیہ اگر نئے حالات کی رعایت نہ کر سکی اور علماء اسلام زمانہ کے پیدا کردہ نئے مسائل کا جواب نہ دے سکے اور فقہ قدیم کی جزئیات پر جمود کی راہ اختیار کی گئی تو آہستہ آہستہ دین سے بیزاری کے رجحانات پیدا ہوں گے۔

نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا

ان حالات کی بنیاد پر میرے نزدیک صحیح راہ یہ ہے کہ ایک طرف مقاصدِ شریعت اور روح احکام پر پوری نگاہ رکھی جائے دوسری طرف اصول وکلیات اور اشباہ ونظائر کو سامنے رکھ کر نئے مسائل کا حل نکالا جائے اور زمانے کے تغیر کی وجہ سے پیدا ہونے

والی مشکلات کو دور کیا جائے، یہی وہ راہ تھی جسے صحابۂ کرامؓ اور اکابر علماء نے ہر دور میں اختیار کی ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو اولاً وہ کتاب اللہ میں اس کے حکم پر غور کرتے، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتے، اور اگر یہاں بھی مسئلہ کا حل نہ نکل پاتا تو علماء صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کے مطابق فیصلہ فرماتے:

قال ابو عبید فی کتاب القضاء حدثنا کثیر بن ھشام عن جعفر بن برقان عن میمون بن مھران قال کان ابو بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنه اذا ورد علیه حکم نظر فی کتاب اللہ تعالیٰ فان وجد فیه ما یقضی به قضی به، و ان لم یجد فی کتاب اللہ نظر فی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فان وجد فیھا مایقضی به قضی به فان اعیاہ ذلك سئل الناس ھل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قضی فیه بقضاء فربما قام الیه القوم فیقولون قضی فیه بکذا و کذا۔ فان لم یجد سنة سنھا النبی صلی اللہ علیه وسلم جمع رؤساء الناس فاستشارھم فاذا اجتمع رایھم علی شئی قضی به۔

(اعلام الموقعین ج۱ ص ٦٢)

ابوعبید نے کتاب القضاء میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو وہ سب سے پہلے قرآن حکیم میں دیکھتے، اگر اس میں ایسی بات مل جاتی جس کی روشنی میں فیصلہ کیا جاسکتا ہو تو فیصلہ فرمادیتے، اور اگر کتاب اللہ میں اس کی نظیر نہ ملتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ڈھونڈتے، اگر ان میں کوئی نظیر مل جاتی تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے اور اگر انہیں سنت رسولؐ میں بھی کوئی اصل نہ ملتی تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ تو ان کے دریافت فرمانے پر بسا اوقات لوگ کھڑے ہو جاتے اور عرض کرتے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ایسا فیصلہ فرمایا تھا۔ اور اگر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت کا کچھ پتہ اس باب میں نہ چلتا تو وہ سرداران قوم کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے پھر جب ان تمام لوگوں کی رائیں کسی بات پر متفق ہو جاتیں تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔

سیدنا عمر بن الخطابؓ کا طرزِ عمل

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور قضایائے ابی بکرؓ کے بعد وہی راہ اختیار کرتے تھے جو سیدنا ابوبکرؓ نے اختیار کی۔

وکان عمرؓ یفعل ذلك فاذا أعیاہ ان یجد ذلك فی الکتاب والسنة سئل ھل کان ابوبکر قضی فیه بقضاء

فـان كـان لابـى بـكـر قـضـاء قضى به والا جمع علماء الناس واستشارهم فاذا اجتمع رايهم على شئى قضى به

(اعلام الموقعين ج١ ص ٦٢)

اورحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یہی کیا کرتے، اور جب انہیں کتاب وسنت میں کوئی اصل بنیاد نظر نہ آتی تو دریافت فرماتے کہ کیا حضرت ابوبکرؓ نے اس طرح کے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ پس اگر حضرت صدیق کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے، ورنہ پھر علماء کو جمع فرماتے اوران سے مشورہ کرتے، اور جب ان کی رائے کسی نقطہ پر جم جاتی اور طے پا جاتی، تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ جو صحابہ میں اپنے تفقہ اور دینی فہم کے اندر ممتاز ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں انہوں نے بھی اس طریق کار کی وضاحت فرمادی ہے، اورفرمایا ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے ہم پر ایسا وقت گذرا ہے جہاں کسی معاملہ کے فیصلہ اور قضا کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اور اب اللہ نے ہمیں اس مقام پر پہنچایا ہے جہاں ہم ان امور کے ذمہ دار ہیں اب ہمارے لئے راہ عمل یہی ہے کہ ہم کتاب اللہ کو رہنما بنائیں، اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی طرف متوجہ ہوں اور تیسرے نمبر پر صالحین کے فیصلوں سے روشنی حاصل کریں، اوراگر یہاں بھی مشکل حل نہ ہوتو پھر راہ اجتہاد کی ہے۔

وقال ابو عبيد حدثنا ابو معاوية عن الاعمش عن عمارة عـن عـمير عن عبد الرحمن بن يزيد عن ابن مسعود قال

اكثـروا عليه ذات يوم فقال انه قد اتى علينا زمان و لسنا نـقضى و لسنا هناك، ثـم ان الله تعالىٰ بلغنا ما ترون فمن عـرض عـليـه قضاء بعد اليوم فليقض بما فى كتاب الله فان جاء ه امر ليس فى كتاب الله و لا قضى به نبيه صلى الـلـه عـليـه و سـلـم فليقض بما قضى به الصالحون، فان جاء ه امر ليس فى كتاب اللّٰه و لا قضى به نبيه صلى الله عليه و سلم و لا قضى به الصالحون فليجتهد رايه۔

(اعلام الموقعين ج ١ ص٦٢)

ابوعبید نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ ایک زمانہ ہم پر ایسا گذرا ہے کہ نہ ہم فیصلہ کرتے تھے اور نہ اس کے اہل تھے پھر اللہ جل شانہٗ نے ہمیں اس مرتبہ تک پہنچایا جہاں تم ہمیں دیکھ رہے ہو، پس جس شخص کے سامنے کوئی معاملہ آئے تو اسے کتاب اللہ میں موجود نظیر کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے، اوراگر اس کی نظیر نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے مطابق کوئی فیصلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو تو پھر صلحاء کے فیصلے اپنے سامنے رکھنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہو۔ اور نہ صلحاء نے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرکے فیصلہ کرنا چاہئے۔

سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ کا بھی یہی حال تھا:

ذكر سفيان ابن عيينة عن عبيد الله ابن يزيد قال سمعت

ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما اذا سئل عن شیء فان کان فی کتاب الله قال به، وان لم یکن فی کتاب الله وکان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال به، فان لم یکن فی کتاب الله ولا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان عن ابی بکر و عمر رضی الله تعالیٰ عنهما قال به، فان لم یکن فی کتاب الله ولا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا عن ابی بکر و عمر رضی الله تعالیٰ عنهما اجتهد رایه۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۳)

عبیداللہ ابن یزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو دیکھا کہ جب ان سے کسی بات کے بارے میں پوچھا جاتا، تو اگر اس کا جواب کتاب اللہ میں مل جاتا تو اسی کے مطابق فرما دیتے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں نظیر مل جاتی تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ اور اگر ان دونوں میں کہیں کچھ نہ ملتا تو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے واقعات میں کوئی بنیاد مل جاتی تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے اور اگر مذکورہ جگہوں میں کہیں کچھ نہ مل پاتا تو اجتہاد فرماتے۔

اور سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھتے ہوئے طریق اجتہاد کی طرف بھی اشارہ فرما دیا اور فرمایا:

الفهم الفهم فیما یختلج فی صدرك مما لم یبلغك فی الکتاب والسنة اعرف الامثال و الاشباه ثم قس الامور

عندك فاعمد الی احبها الی الله واشبها بالحق فیما تری۔

(الاشباه والنظائر للسیوطی ص۶)

جو چیزیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہ ملیں تو ان پر بار بار غور کرو اور فہم سے کام لو۔ پھر مثالوں اور نظیروں کو معلوم کرو۔ اس کے بعد قیاس کرو، اور پھر ایسا پہلو اختیار کرو، جو تمہارے خیال میں اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور حق کے زیادہ قرین ہو۔

اس طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر دور میں پیدا ہونے والے نئے مسائل اور نئے حالات میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ایک واضح طریق کار متعین فرما دیا اور وہ یہ کہ شریعت میں مختلف مسائل پر احکام کی جو نظیریں منصوص اور منقول ہیں ان پر نگاہ رکھی جائے تاکہ غیر منصوص مسائل کو منصوص مسائل پر قیاس کیا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ ان نظائر کے درمیان جو باریک فرق ہیں ان پر بھی نگاہ رکھی جائے تاکہ اشتباہ نہ پیدا ہونے پائے، اور پھر اس بنیادی اصول کی طرف بھی رہنمائی فرمادی کہ اگر احکام کی روح اور مشروعیت کے مقاصد کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے تاکہ نئے مسائل میں احکام کے استخراج کے وقت مصالح شرعی فوت نہ ہونے پائیں اور شارع کی نظر کسی حکم کی مشروعیت کے وقت جن حکمتوں پر رہتی ہے وہ فوت نہ ہو جائیں۔

آثار صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے فیصلے

آثارِ صحابہ کے تتبع سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بہتیرے مسائل میں صحابہ نے

یہی راہ اختیار کی ہے، اسی طرح علماء مجتہدین اور ہر دور کے علماء اپنے وقت کی نزاکتوں اور اصول شریعت کو سامنے رکھ کر اپنے دور کے مسائل کا حل کرتے رہے ہیں جن کے نظائر سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خود سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے بہت سارے فیصلوں میں قرآن وسنت کی روح اور وقت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام جاری کئے ہیں مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عمر فاروقؓ کے دور میں عورتیں مسجد جایا کرتی تھیں لیکن سیدنا عمرؓ فاروق نے سیکڑوں برس پہلے فتنہ کی بو محسوس کر لی اور زمانہ کی تبدیلی اور حالات کے انقلاب نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ نگاہوں کی عصمت جو زمانہ نبوت میں تھی وہ باقی نہیں رہی ہے مسجد کی فضیلت اور فتنے کے دروازوں کو بند کرنا دونوں کے درجوں میں جو فرق ہے اسے سامنے رکھا۔ اور عورتوں کو مسجد کی حاضری سے حکماً روک دیا۔ اسی طرح مجاہدین کے بارے میں حکم دیا کہ وہ چار ماہ سے زیادہ باہر نہ رہیں ایک طرف جہاد اور جنگی حالات کا تقاضا اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے سماج کو فتنوں سے محفوظ رکھنا۔ دونوں حالات پر غور کر کے سیدنا عمر فاروقؓ نے چار ماہ کی حد مقرر فرمادی، اسی لئے القضاء فی الاسلام کے مصنف نے لکھا ہے:

فكان عمرؓ يجتهد فى تعرف الحكمة التى نزلت فيها الآية و يحاول معرفة المصلحة التى جاء من اجلها الحديث و ياخذ بالروح لا بالحرف۔ (القضاء فى الاسلام ۱۰۴، كتاب قضاء عمرؓ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت کے نزول کی حکمت کو جاننے کی سعی فرماتے۔ اور اس مصلحت کو معلوم کرتے جس کے سبب حدیث وارد ہوتی تھی۔

ائمہ کرام کے فتاویٰ میں تجربہ کا اثر - چند مثالیں

(۱) اسی طرح بعد کے علماء نے حالات اور زمانہ کے تقاضوں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا چنانچہ امام ابوحنیفہؒ مدعا علیہ کی حاضری، سماع دعویٰ، سماع شہادت اور فیصلہ ان تینوں اوقات میں ضروری قرار دیتے ہیں، اور اگر ان تینوں اوقات میں سے کسی وقت بھی مدعا علیہ غیر حاضر ہو جائے تو اسے قضاء علی الغائب قرار دیتے ہیں، اور ایسا فیصلہ نافذ تسلیم نہیں کرتے، بخلاف اس کے امام ابو یوسف علیہ الرحمہ جن کو امور قضاء سے زیادہ سابقہ پڑا، فرماتے ہیں کہ مدعا علیہ کی حاضری صرف دعویٰ اور شہادت کے وقت ضروری ہے، بعد کے علماء نے جب یہ محسوس کیا کہ بعض اوقات مدعا علیہ حاضر نہیں ہوتا اور نہ اس کا حاضر کیا جانا ممکن ہے۔ اور اگر اس شرط کی پابندی کی جائے تو سیکڑوں انسانوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے اور نظام قضا کی بنیادی مصلحت یعنی حقوق کی حفاظت اور عدل کا قیام ختم ہو جائے گا اور احکام معطل ہو جائیں گے تو انہوں نے اس معاملہ کو قاضی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا کہ وہ واقعات کی اصل نوعیت پر غور کرے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور حرج وضرورت کا خیال رکھے۔ اور پھر ان سارے حالات ومسائل کو پیش نظر رکھ کر قاضی فیصلہ کرے، اور مفتی فتویٰ دے، شامی نے جامع الفصولین کے حوالہ سے لکھا ہے:

قال فى جامع الفصولين قد اضطربت آراؤهم و بيانهم فى مسائل الحكم للغائب و عليه ولم يصف ولم ينقل عنهم اصل قوى ظاهر يبنى عليه الفروع بلا اضطراب ولا اشكال فالظاهر

عندی ان یتامل فی الوقائع و یحتاط و یلاحظ الحرج والضرورات۔ فیفتی بحسبها جوازاً و فساداً مثلاً لو طلق امرأته عند العدل فغاب عن البلد ولا یعرف مکانه او یعرف ولکن یعجز عن احضاره او عن ان تسافر الیه هی او وکیلها لبعده او لمانع آخر و کذا المدیون لو غاب وله نقد فی البلد او نحوه ذلك ففی مثل هذا لو برهن علی الغائب و غلب علی ظن القاضی انه حق لا تزویر ولا حیلة فیه فینبغی ان یحکم علیه وله وکذا للمفتی ان یفتی بجوازه دفعا للحرج و الضرورات و صیانة للحقوق عن الضیاع مع انه مجتهد فیه۔ ذهب الیه الائمة الثلاثة و فیه روایتان عن اصحابنا و ینبغی ان ینصب عن الغائب وکیل یعرف انه یراعی جانب الغائب ولا یفرط فی حقه، واقره فی نور العین قلت و یؤید مایاتی قریباً فی المنحر و کذا ما فی الفتح من باب المفقود لا یجوز القضاء علی الغائب إلا اذا رای القاضی مصلحة فی الحکم له و علیه فحکم فانه ینفذ لانه مجتهد فیه۔ قلت وظاهره ولو کان القاضی حنفیا ولو فی زماننا ولا ینافی مامر لان تجویز هذا للمصلحة والضرورة۔

(شامی ج۸ ص۹۶،۹۷، کتاب القضاء المسائل التی یکون القضاء فیها علی الحاضر قضاء علی الغائب)

صاحب جامع الفصولین نے لکھا ہے کہ مفقود الخبر کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ کرنے میں لوگوں کی رائیں اور ان کے بیانات مختلف ہیں اور ان سے کوئی ایسی مضبوط بنیاد نہیں نقل کی گئی ہے جس پر بلا اضطراب کے فروع کی بنیاد رکھی جاسکے۔ اس لئے میرے نزدیک واضح بات یہ ہے کہ

مفتی واقعات میں غور وفکر کرے، اور احتیاط برتے اور تنگیوں، دشواریوں اور ضرورتوں کو مدنظر رکھے پھر اسی کے مطابق جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دے، مثلاً اگر کسی نے اپنی بیوی کو شاہد عادل کی موجودگی میں طلاق دیدی، گواہ شہر سے کہیں اور چلا گیا۔ اور اس جگہ کی کوئی خبر نہیں۔ یا اسے حاضر کرنے سے عاجز ہے۔ یا خود عورت یا اس کا وکیل بعد مسافت یا کسی اور مانع کی بنا پر اس کے پاس جانے سے قاصر ہے۔ اسی طرح قرضدار کا حال ہے کہ اگر وہ غائب ہوگیا اور اس کا کچھ مال (نقدی) شہر میں ہے تو اس قسم کی صورت حال میں اگر مفقود الخبر کے خلاف شہادتیں قائم کردی گئیں اور قاضی کو ظن غالب حاصل ہوگیا کہ وہ صحیح ہے تو مناسب یہ ہے کہ مفقود الخبر کے خلاف یا اس کے حق میں فیصلہ کردے۔ اور اسی طرح مفتی، مجتہد بن کر دفع حرج، صیانۃ حقوق، اور ایفاء ضرورت کے لئے جواز کا فتویٰ دے۔ یہی قول ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا ہے اور ہمارے ائمہ کے اس بارے میں دو قول ہیں، مناسب یہ ہے کہ مفقود الخبر کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک وکیل مقرر کیا جائے۔ اور ایسا ہی فتح القدیر میں مفقود الخبر کے بارے میں ہے کہ قضاء علی الغائب جائز نہیں۔ مگر جب کہ قاضی اس کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنے میں کوئی مصلحت دیکھے، اور یہ فیصلہ نافذ ہوگا، کیونکہ وہ اس مسئلہ میں مجتہد ہے، میرے نزدیک اگرچہ قاضی حنفی ہو، اور ہمارے ہی زمانہ کا ہو۔ پھر بھی وہ مصلحت اور ضرورت کے پیش نظر مفقود الخبر کے معاملہ میں مذکورہ بالا نہج پر فیصلہ کرسکتا ہے اور مفتی فتویٰ دے سکتا ہے۔

(۲) اسی طرح استیجار علی الطاعات کا مسئلہ ہے جس کے بارے میں متقدمین کا فتویٰ عدم جواز کا تھا لیکن جب نظام بیت المال فاسد ہوا اور حالات ایسے پیدا

ہو گئے کہ یا تو اس کی اجازت دی جائے یا پھر تعلیم قرآن کے ضیاع کا خطرہ مول لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان نقصان تھا، جسے کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا، علماء نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کیا اور دیکھا کہ بیت المال سے وظائف کا کوئی نظم نہیں اور لوگوں میں بطور خود اپنے عطیات کے ذریعہ اس کو چلانے کا کوئی جذبہ نہیں۔ ایسی صورت میں دو ہی شکلیں تھیں یا تو معلمین کے بال بچے ضائع ہوں اور ان کی معاش تباہ ہو یا پھر قرآن کی تعلیم ختم ہو جائے۔ پہلی شکل ممکن نہ تھی اور نہ درست۔ اور دوسری صورت ناقابل برداشت۔ ایسے حالات میں مشائخ بلخ نے تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز قرار دیا۔ اور پھر بعد کو اذان و امامت جن کی حیثیت شعائر دین کی ہے جب ان کے فوت کا بھی خطرہ محسوس کیا گیا تو علماء نے اذان و امامت پر بھی اجرت کو جائز قرار دیا۔

اعلم ان عامة كتب المذهب من متون و شروح و فتاویٰ كلها متفقة على ان الاستئجار على الطاعات لا يصح عندنا واستثنیٰ المتاخرون من مشائخ بلخ تعليم القرآن فجوزوا الاستئجار عليه و عللوا ذلك فى شروح الهداية و غيرهما بما مرّ وهى خوف ضياع القرآن لانه حيث انقطعت العطايا من بيت المال و عدم الحرص على الدفع بطريق الحسبة ليشتغل المعلمون بمعاشهم ولا يعلمون احدا ويضيع القرآن فافتى المتاخرون بالجواز لذلك واستثنیٰ بعضهم ايضا الاستئجار على

الاذان و الامامة للعلة المذكورة لانهما من شعائر الدين ففى تفويتهما هدم الدين فهذه الثلثة مستثناة للضرورة فان الضرورة تبيح المحظورات۔ (فتاویٰ حامدیہ ج۲ ص ۱۲۷)

حنفیہ کے متون، شروح اور فتاویٰ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ استئجار علی الطاعات (بندگی اور طاعت پر اجرت لینا) درست نہیں۔ متاخرین مشائخ بلخ نے تعلیم قرآن کو مستثنیٰ کہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم قرآن پر اجرت کو جائز قرار دیا۔ اس لئے کہ جب بیت المال کے وظیفے بند ہو گئے اور مسلمانوں میں معلمین قرآن کی امداد کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا اور یہ خطرہ پیدا ہوا کہ معلمین اپنے اپنے معاش میں مشغول ہو کر کسی کو تعلیم نہ دے سکیں گے، اور اس طرح قرآن کے ضیاع کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا تو متاخرین نے جواز کا فتویٰ دیدیا۔ اسی طرح اجرت لے کر اذان دینے اور امامت کرنے کو بھی مذکورہ اسباب ہی کے تحت مستثنیٰ قرار دیا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں شعائر دین میں سے ہیں، اور ان کے ضائع ہونے سے دین ہی کے برباد ہو جانے کا خطرہ ہے، فقہ کا اصول ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو بھی جائز کر دیا کرتی ہیں اسی اصول کے تحت تعلیم قرآن، اذان اور امامت کو مستثنیٰ کیا گیا۔

پس وقت کے علماء کے سامنے جب یہ سوال پیدا ہوا تو انہوں نے شریعت کی ایک ضروری مصلحت کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھ کر اھون البلیتین کو اختیار فرمایا اور الضرورات تبیح المحظورات کی روشنی میں اپنے قدیم فتوؤں میں ترمیم کی اور اس یقین کے ساتھ کی کہ اگر امام ابوحنیفہؒ بھی ان حالات سے دوچار ہوتے تو یہی

رائے دیتے:

وانما افتى المتاخرون بجواز ذلك على التعليم بالضرورة المذكورة التى لو وقعت فى زمن ابى حنيفة و اصحابه لافتوا بذلك فلذلك افتى المتاخرون بجواز ذلك مخالفا لمذهب الصريح و لوزالت الضرورة بان انتظم امر بيت المال و اعطى المعلمون ما كان له فيه كفاية لم يسع احد المتاخرين ان يخالفوا المذهب لزوال العلة التى سوغت لهم الخروج عن اصل المذهب۔ (فتاویٰ حامدیہ ج۲ص۵۷)

متاخرین نے استیجار علی التعلیم کے جواز کا فتویٰ ضرورت کی بناء پر دیا تھا، کہ اگر یہ صورت حال امام ابوحنیفہؒ اوران کے اصحاب کے زمانہ میں پیش آئی ہوتی، تو وہ بھی یہی فتویٰ دیتے اسی بناء پر متاخرین نے صریح مسلک کے خلاف جواز کا فتویٰ دیا۔ اور اگر بیت المال کا نظم استوار ہوجائے اور معلمین وغیرہ کو بقدرِ کفاف وظیفہ ملا کرے تو ضرورت ختم ہوجائے گی، اور کسی کے لئے اپنے مسلک و مذہب سے ہٹ کر فتویٰ دینے کی گنجائش باقی نہ رہے گی، کیونکہ وہ سبب ہی باقی نہ رہا جس کی بنیاد پر اپنے مسلک کے خلاف فتویٰ دینے کی اجازت ہوئی تھی۔

کتب فقہ کے تتبع سے اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں کہ علماء نے عرف کے بدل جانے کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی کا فتویٰ دیا ہے اور عرف کو اصول تقنین میں خاص اہمیت دی گئی ہے، اور عرف کے مختلف مدارج اور اس کے مفصل احکام کتب فقہ

میں مذکور ہیں، امام سرخسیؒ نے مبسوط میں لکھا ہے:

الثابت بالعرف كالثابت بالنص

رسائل ابن عابدین میں ہے:

الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعى

جو بات عرف سے ثابت ہے وہ گویا شرعی دلیل سے ثابت ہے۔

قنیہ میں ہے:

ليس للمفتى و لا للقاضى ان يحكم على ظاهر المذهب و يترك العرف۔

مفتی اور قاضی کے لئے ظاہر مذہب کے مطابق فیصلہ کرنا اور عرف کو نظر انداز کردینا درست نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح بیسوی صدی کے اوائل میں جب ہندوستان میں شرعی امارت کا سوال اٹھا تو بہار واڑیسہ میں امارت شرعیہ کے ساتھ ساتھ دارالقضاء کا قیام بھی عمل میں آیا، اور ہمارے قضاۃ کے سامنے پرسنل لا سے متعلق مختلف قسم کے مقدمات پیش ہوئے، اور انہیں بہت سارے مسائل میں زمانہ کے تغیر، حالات کی تبدیلی، رفع حرج اور سد باب فتن کی خاطر کچھ نئی راہیں اختیار کرنی پڑیں۔ مثلاً اس قسم کے بے شمار مقدمات سامنے آئے جہاں شوہر کسی بھی وجہ سے بیوی کو چھوڑ دیتا ہے، نان ونفقہ، حقوق زوجیت سے محروم رکھتا ہے، اوراس طرح جوان عورت برسہابرس تک تکلیف مالایطاق جھیلتی رہتی ہے۔ اس کے میکہ کی طرف سے بھی اس کے نفقہ کا کوئی نظم نہیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات:

فتذروها کالمعلقة۔ اورتم انہیں معلق چھوڑ دو (نساء:۱۲۹)

یا

فلهن مثل الذی علیهن بالمعروف۔ (بقرہ:۲۲۸)

اورعورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے، دستور کے موافق۔

الرجال قوامون علی النساء۔ (النساء: ۳۴)

مردحاکم ہیں عورتوں پر۔

کی وجہ سے جو ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں وہ ان سے قطعاً غافل ہے۔ اور زمانہ فتنہ کا ہے جب کہ گمراہیوں کی کشش زیادہ ہے۔ اور عفت وآبرو کا باقی رکھنا مشکل کام ہے۔ نکاح کی مشروعیت کے جو مقاصد ہیں وہ پوری طرح فوت ہوجاتے ہیں، دوسری طرف اگر قضاۃ یہ فیصلہ کریں کہ عورت شوہر کے نام پر قرض لے اور اس طرح پر نفقہ پورا کرے تو ظاہر ہے کہ آج کے حالات میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ جب کہ حنفی فقہاء کا یہی فیصلہ ہے کہ نان ونفقہ میں تنگی تفریق کا سبب نہیں۔

ومن اعسر بنفقة امرأته لم يفرق بينهما و يقال لها استديني عليه (هدايه باب النفقة ص ۴۱۹)

جوشخص اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرنے سے قاصر ہوجائے تو ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائیگی بلکہ عورت سے کہا جائے گا کہ وہ قرض حاصل کرے جس کی ادائیگی اس کے شوہر کے ذمہ ہوگی۔

صاحب ہدایہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ تفریق کی صورت میں مرد کا حق

بالکلیہ باطل ہوجاتا ہے اور تفریق نہ کرکے اگر عورت کو قرض لینے کا حکم دیا جائے تو عورت کا حق مؤخر ہوجاتا ہے اور حق کو ختم کردینے کا نقصان حق کے مؤخر کردینے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے قوی ضرر دور کیا جائے گا، اور اگر کوئی یہ کہے کہ شوہر اگر حقوقِ جنسی کے ادا کرنے کے لائق نہ ہوتو نکاح فسخ کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مالی حق کی ادا کاری کے لائق نہ ہوتو نکاح فسخ ہونا چاہئے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ جنسی حقوق کو نکاح میں مقصدیت کا درجہ حاصل ہے، اور مالی حق تابع کا درجہ رکھتا ہے اس لئے یہ صحیح نہ ہوگا کہ ثانوی درجہ کی چیز کی بربادی کو اصل اور مقصود کی بربادی پر قیاس کیا جائے۔

ولنا ان حقه يبطل و حقها يتاخر والاول اقوىٰ فى الضرر وهذا لان النفقة تصيردينا بفرض القاضى فتستوفىٰ فى الزمان الثانى و فوت المال وهو تابع فى النكاح لا يلحق بما هو المقصود وهو التناسل۔

(ہدایہ باب النفقۃ ۴۱۹)

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ شوہر کا حق باطل ہوجاتا ہے، اور بیوی کا مؤخر، اور پہلی شق ضرر کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے، اس لئے کہ نفقہ قاضی کے فیصلہ کے بعد شوہر پر قرض ہوجائے گا جو دوسرے وقت ادا ہوگا۔ اور نفقہ (مال) کی حیثیت نکاح میں تابع کی ہے، اصل مقصود تناسل ہے، لہٰذا تابع کو مقصود کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔

لیکن آج کے حالات میں ظاہر ہے کہ اس جزئیہ پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے جبکہ

مقاصد نکاح میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے طرفین کی نگاہوں میں عصمت پیدا ہوتی ہے، اور آبرو محفوظ رہتی ہے، اس فتنہ کے دور میں ایک ایسی عورت جو معلقہ پڑی ہوتی ہے اس کی معاشی ضرورتیں اسے آسانی کے ساتھ گمراہی کے گڑھوں میں دھکیل سکتی ہیں، پس مقاصد نکاح کو فوت ہوتے ہوئے اور احکام قرآن کی صریح خلاف ورزی دیکھتے ہوئے مصالح شرعی کے تحفظ، سد باب فتن کی خاطر نفقہ نہ دینے کی شکل میں ہمارے قضاۃ کو تفریق کا فیصلہ کرنا پڑا۔

نئے عہد میں مسائل کے حل کی راہ

بہر حال آج بھی بہت سارے نئے مسائل اور نئے حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کا تقاضہ یہ ہے کہ علماء فقہ کی روشنی میں اس کا جواب دیں، اس سلسلہ میں اگر تجزیہ کیا جائے تو مسائل دو قسم کے سامنے آتے ہیں۔

(۱) کچھ تو وہ مسائل ہیں جن سے قدیم فقہاء کو دوچار ہونا نہیں پڑا، اور کتاب و سنت، اجماع و قیاس مجتہدین اس مسئلہ میں ساکت ہیں۔

(۲) دوسری قسم ان مسائل کی ہے جن کے احکام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اول الذکر مسائل کو شریعت کے اصول کی روشنی میں حل کرنا ہوگا۔ اور ثانی الذکر مسائل میں مصالح و حکم شرعی کی رعایت کرتے ہوئے اور نصوص کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے حالات کے مطابق حکم کا استخراج کرنا پڑے گا۔

یہ دوسری قسم کے مسائل جن پر اپنے اصول اجتہاد کے پیش نظر مجتہدین نے اپنی

رائے ظاہر کردی ہے لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے اور موجودہ دور میں ان جوابات پر عمل دشوار نظر آتا ہے۔ ایسے مسائل کے حل کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی خاص فقہی مکتب فکر کی پابندی سے قطع نظر کر کے دوسرے مسلمہ فقہی مکاتب فکر میں اس کا جواب تلاش کیا جائے۔ اگر کسی اور فقہی مسلک میں اس کا جواب مل جاتا ہے تو اسے قبول کرلیا جائے جیسا کہ ''زوجۂ مفقود الخبر'' کے معاملہ میں علماء احناف نے حنفی مسلک چھوڑ کر مذہب مالکی اختیار کیا اور اسی پر فتویٰ دیا۔ اور آج اس عورت کے لئے جس کا شوہر مفقود ہے انتظار کی مدت یوم اطلاع سے چار سال ہے، زیادہ نہیں۔

یا جس طرح ''ممتدۃ الطہر'' کے معاملہ میں علمائے احناف نے امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے۔

قلت و نظير هذه المسئلة عدة ممتدة الطهر التى بلغت برویة الدم ثلاثة ايام ثم امتد طهرها فانها تبقى فى العدة الى ان تحيض ثلاث حيض۔ و عند مالك تنقضى عدتها بتسعة اشهر وقد قال فى البزازية الفتوىٰ فى زماننا على قول مالك۔ وقال الزاهدى كان بعض اصحابنا يفتون به للضرورة۔ (ردالمختار: ج ۶، ص ۳۵۷، ۳۵۸، کتاب المفقود)

اور اس کی نظیر ممتدۃ الطہر کی عدت ہے جو تین دنوں تک (حیض کا) خون دیکھ کر بالغ ہوئی تھی، پھر وہ ممتدۃ الطہر ہوگئی تو وہ اس وقت تک عدت میں رہے گی جب تک تین حیض نہ آجائیں۔ اور امام مالکؒ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی عدت نو مہینوں میں تمام ہوگی۔

اور بزازیہ میں لکھا ہے کہ فتویٰ ہمارے زمانہ میں امام مالکؒ کے قول پر ہے۔

زاہدی نے کہا ہے کہ ہمارے بعض علماء ضرورت کی بناء پر امام مالکؒ ہی کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

مسئلہ فقہی مکاتب فکر یعنی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک کو کسی مسئلہ میں اختیار کر لینا تو درست ہے ہی، ضرورت کی بنیاد پر کسی مرجوح قول کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے، اگر مفتی کے سامنے کوئی مسئلہ آیا، اور اس کا جواب بھی ائمہ اربعہ میں کسی کے مذہب میں موجود ہے۔ لیکن وہ جواب مسلم معاشرہ میں وقت کی پیدا کردہ واقعی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، یا زمانہ اور حالات کے تحت اس مسئلہ میں سہولت اور تسہیل کی ضرورت ہے، جو ائمہ اربعہ کے مذاہب کے ذریعہ نہیں ہوتی تو مفتی فقہائے اسلام میں سے کسی کے مرجوح قول کو بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس پر فتویٰ دے سکتا ہے۔

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:

فقد ذكر في حيض البحر في بحث الوان الدماء اقوالاً ضعيفة ثم قال وفي المعراج عن فخر الائمة لو افتىٰ مفتٍ بشيء من هذه الاقوال في مواضع الضرورة للتيسير كان حسناً (ردالمحتار ص:۶۹ ج۱)۔

صاحب بحر نے حیض کے باب میں حیض کے خون کے رنگوں کے سلسلے میں کچھ ضعیف اقوال نقل کئے ہیں، پھر انہوں نے معراج کے حوالہ سے فخر الائمہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کسی مفتی نے آسانی کے لئے ضرورت کے موقعوں پر ان ہی ضعیف اقوال میں سے کسی پر فتویٰ دیدیا تو یہ بہتر ہوگا۔

کتب فقہ میں ایک بحث یہ ہے کہ اگر مقروض سے ادائے قرض کی کوئی امید اور راہ نہ ہو تو قرض خواہ کے لئے مقروض کے مال میں سرقہ کر کے اپنے قرض کو وصول کر لینا درست ہے یا نہیں؟

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سرقہ کر سکتا ہے اور اس سے دیانۃً اپنے قرض کو وصول کر سکتا ہے، لیکن قرض اور مال سرقہ ایک ہی جنس کا ہونا چاہئے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر دو جنس کا ہو جب بھی اس حالت میں اپنے قرض کی وصولی کے لئے سرقہ درست ہے۔

اسی مسئلہ پر ''صاحب درمختار'' نے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

واطلق الشافعيؒ اخذ خلاف الجنس للمجانسة في المالية قال في المجتبىٰ وهو اوسع فيعمل به عند الضرورة۔ (الدرالمختار: ج۶ ص۱۱۷)

(كتاب السرقة) مطلب يعذر بالعمل بمذهب الغير عند الضرورة على هامش

اور امام شافعیؒ نے مالیت میں اشتراک کی بناء پر ایسے مال کا لینا بھی جائز قرار دیا ہے جو قرض کے جنس سے نہ ہو، المجتبیٰ میں اس کو ''اوسع'' کہا گیا ہے، لہٰذا اس پر ضرورت کے وقت عمل کیا جائے گا۔

درمختار کی اس عبارت پر علامہ شامیؒ (م۱۲۵۲ھ) نے لکھا ہے جس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت اور وسعت و تسہیل کی خاطر دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا بالکل درست ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ شامیؒ کی

عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسائل واحکام میں زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کی ممکن رعایت نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قال القهستانی و فیه ایماء الی ان له ان یأخذ من خلاف جنسه عند المجانسة فی المالیة وهذا اوسع فیجوز الاخذ به وان لم یکن مذهبا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة کما فی الزاهدی (قال الشامی) رأیت فی شرح النظم ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاوعتهم فی الحقوق والفتویٰ الیوم علی جواز الاخذ عند الضرورة من ای مال کان لاسیما فی دیارنا لمداومتهم للعقوق۔ شعر:

عفاء علی هذا الزمان فانه　　زمان عقوق لازمان حقوق

وکل رفیق فیه غیر مرافق　　وکل صدیق فیه غیر صدوق

(ردالمحتار: ج۶ ص:۱۱۷، کتاب السرقۃ)

قہستانی نے فرمایا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے لئے مجانست مالیہ کے موقع پر خلاف جنس کو لینا جائز ہے اور یہی ''اوسع'' ہے پس اسے اختیار کرنا اگرچہ ہمارا مسلک نہ ہو، جائز ہے، اس لئے کہ انسانی ضرورت کے وقت اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے جیسا کہ زاہدی میں ہے (شامی فرماتے ہیں) میں نے شرح النظم میں دیکھا ہے کہ خلاف جنس لینے کا عدم جواز ان لوگوں کے زمانہ میں اس بناء پر تھا کہ وہ لوگ

ادائیگی حقوق میں پیش پیش تھے لیکن آج کل ضرورۃً جواز پر ہے خصوصاً ہمارے دیار میں چونکہ لوگ حق تلفی کے عادی ہیں۔

شعر کا ترجمہ: اس زمانہ میں معاف ہے اس لئے کہ یہ حق تلفی کا زمانہ ہے نہ کہ ادائے حقوق کا۔ آج کل نہ کوئی رفیق ہمدرد ہے اور نہ کوئی دوست مخلص۔

بہرنوع مسائل واحکام کی دو قسمیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ ایک تو وہ جن سے قدیم فقہاء کو دوچار ہونا نہیں پڑا۔ دوسرے وہ مسائل جن کے احکام کتب فقہ میں تو موجود ہیں لیکن بدلے ہوئے حالات میں ان پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

پہلی قسم کے مسائل کو اسلام کے اصل قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کرنا ہوگا۔ اور دوسری قسم کے مسائل میں نصوص شرعیہ کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر شرعی حکم معلوم کرنا پڑے گا۔

اجتہاد

ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے یہ کام ہیں، اور اجتہاد کے لئے جو شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں ان کا کسی ایک شخص میں پایا جانا آج کے دور میں مشکل ہے۔ شامی نے اجتہاد مطلق کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

وشرطهٗ الاسلام والعقل والبلوغ وکونه فقیه النفس ای شدید الفهم بالطبع وعلمه باللغة العربیة وکونه حاویاً لکتاب الله تعالیٰ فی ما یتعلق بالاحکام وعالما

بالحديث متنا و سنداً و ناسخا و منسوخاً و بالقياس۔

(شامی ج۸،ص۳۶، کتاب القضاء مطلب فی الاجتهاد وشروطه)

اوراس کی شرط اسلام، عقل، بلوغ، فقیہ النفس یعنی فطری وطبعی طور پر خوب سمجھ دار ہونا، عربی زبان پر عبور، کتاب اللہ کے اس حصہ پر حاوی ہونا جو احکام سے متعلق ہو، حدیث کے متن، سند اور ناسخ ومنسوخ سے واقف ہونا اور قیاس سے آگاہ ہونا ہے۔ ان شرائط کی مزید تفصیلات دوسری کتابوں میں درج ہیں۔

موجودہ دور میں اجتہاد کی عملی شکل

آج جب کہ استخراج احکام کی ضرورت ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ جدید مسائل پر ایسی رائیں دے رہے ہیں جو کتاب وسنت سے متعارض ہیں اور اپنی پشت پر اصول شرع سے کوئی استناد نہیں رکھتیں جن سے سخت گمراہی اور فتنہ کا خطرہ ہے، ایسے حالات میں کسی خاص فرد کو تو یہ فرض سونپ دینا درست نہیں۔ لیکن علماء اور اصحاب نظر کی ایک جماعت جو دین کے متعلق ضروری علوم میں پوری مہارت رکھتی ہو اور اس کی نگاہ زمانۂ حال اور اس کی ضروریات ملک کے تمدنی وثقافتی معاملات پر گہری ہو، نیز تاریخ اسلام، فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان تاریخی عوامل پر نگاہ ہو جو مختلف مراحل میں قانون پر اثر انداز ہوئے ہوں، ایسے لوگ جمع ہوں اور کتاب وسنت، آثار صحابہ اجماع متقدمین اور اجتہاد فقہاء کو سامنے رکھ کر اپنی پوری صلاحیتیں اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ صرف کریں تو امید ہے کہ ان مسائل کا حل نکل سکے گا۔ اور ہم اس ذمہ داری

سے عہدہ برآ ہوسکیں گے جو شریعت خداوندی کی طرف سے موجودہ حالات میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔

اجتماعی طریقہ اجتہاد کوئی نئی چیز نہیں!

یہ اجتماعی طریقۂ اجتہاد واستخراج مسائل کوئی نئی چیز نہیں جسے صرف آج کہا جارہا ہو۔

(۱) سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب کہ اسلامی حکومت کا دائرہ عرب سے باہر نکل کر دور، دور تک پھیل چکا تھا اور اسلام کا علم ایسے ملکوں اور ایسے علاقوں میں نصب کیا جاچکا تھا جہاں کی زبان، تہذیب اور اس ملک کے جغرافیائی حالات عرب سے بالکل مختلف تھے، اور اسی بنیاد پر نئے مسائل اکثر و بیشتر سامنے آتے رہتے تھے۔ عربوں کا تمدن بھی حکومت کے قیام، دولت کی فراوانی اور دوسرے ملکوں سے اختلاط کے باعث دن بدن اونچا ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات میں صحابۂ کرام کی دو مجلسیں بنیں۔

ایک مجلس تو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتب فرمائی جس میں خود خلیفۂ دوم اور حضرت زید ابن ثابت اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین شریک تھے۔

دوسری مجلس سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابی ابن کعب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اجمعین کو ساتھ لے کر بنائی۔

آثار امام محمدؒ میں ہے:

كان ستة من اصحاب النبی ﷺ يتذاكرون الفقه بينهم
علیؓ، ابیؓ ابو موسیٰ علیحدة عمرؓ زیدؓ ابن مسعود
علیحدة (تذکرہ اعظم ص ۱۱۱ بحوالہ آثار امام محمدؒ)

جناب رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے چھ ایسے تھے جو آپس میں فقہ کا مذاکرہ کرتے تھے حضرت علیؓ حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ اور حضرت عمرؓ حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک ساتھ۔

یہ دونوں مجلسیں وہی کام انجام دیتی تھیں جن کی آج ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ صحابہ کرامؓ کی جماعت میں ایسے اصحاب موجود تھے جو مسائل بتلاتے اور دینی امور پر فتاویٰ دیا کرتے۔ لیکن جب ایسے مسائل سامنے آنے لگے جن سے بظاہر قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ ﷺ ساکت نظر آتیں تو پھران مسائل پر صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت غور کرتی اور فکر و بحث کے بعد کسی فیصلہ کا اعلان ہوتا۔

(۲) صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ کے زمانہ میں بھی مدینہ طیبہ کے ساتھ فقہاء کی ایک مجلس کا ذکر تہذیب التہذیب میں ملتا ہے اس مجلس کے سامنے وقت کے پیش آمدہ مسائل پیش ہوتے اصحاب مجلس باہم بحث و مذاکرہ کے بعد کسی فیصلہ کا اعلان کرتے۔ مدینہ کے قاضی کے سامنے بھی جب کوئی نئے قسم کا مقدمہ آتا تو اس کی روداد ان سات فقہاء کی مجلس کے سامنے پیش کی جاتی اور قاضی اس مقدمہ میں اس مجلس کی رائے لئے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرسکتا تھا۔

قال علی بن الحسن العسقلانی عن ابن المبارك قال

كان فقهاء اهل المدينة سبعة و كانوا اذا جاء تهم المسئلة دخلوا فيها جميعاً فنظروا فيها ولا يقضی القاضی حتی يرفع اليهم فينظرون فيها فيصدرون۔

(تہذیب التہذیب ص ۴۳۷ ج ۳ فی تذکرۃ سالم بن عبداللہ المتوفیٰ ۱۰۶ھ۔)

سات فقہاء اہل مدینہ تھے جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ سب یک جا غور و فکر کرتے قاضی بھی اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتا تھا جب تک کہ مسئلہ کو ان کے سامنے پیش نہ کردے اور وہ غور و فکر کر کے کوئی فیصلہ نہ کردیں۔

(۳) غرض خیر القرون میں بھی جدید مسائل اور پیش آمدہ معاملات کے لئے ایسی مجلسیں موجود تھیں جو تنقیح مسائل اور استخراج احکام کا کام انجام دیا کرتی تھیں۔ مجتہد اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بھی تدوین فقہ اسلامی کا اتنا بڑا اور عظیم الشان کام تنہا نہیں انجام دیا الجواہر المضیئہ اور جامع المسانید وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ نے بھی فقہ اسلامی کا بہت بڑا حصہ اپنے باکمال تلامذہ کی مجلس کے غور و فکر اور بحث و مذاکرہ کے بعد مرتب فرمایا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فقہی مسائل کو اپنے تلامذہ کی مجلس میں پیش فرمایا کرتے اور پھر ان پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں، اب اگر یہ مجلس کسی متفقہ مسئلہ پر پہونچتی تو وہ قلم بند ہوتا یا اس کا اعلان کیا جاتا ورنہ مجلس کے ہر رکن کی رائے علیٰحدہ علیٰحدہ محفوظ کرلی جاتی۔

(الجواہر المضیئہ ص ۱۴۰ ج ۱، وجامع المسانید ص ۳۳ ج ۱)۔

امام اعظمؒ کی اس تدوین فقہ والی مجلس میں جو حضرات شریک ہوتے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن کا امام تھا۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (م۱۳۰۴ھ) نے عمدۃ الرعایہ میں لکھا ہے کہ، یہ مجلس مشاہیر علمائے مجتہدین اور فضلائے متقدمین پر مشتمل تھی۔ اور پھر اس مجلس کے ارکان کے نام لے کر بتلایا ہے کہ کون کس فن میں امتیاز رکھتا تھا۔

اسی لئے مشہور محدث وکیع بن الجراح کہا کرتے تھے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے کاموں میں غلطیاں کس طرح رہ سکتی تھیں جب کہ ان کے ساتھ تدوین فقہ اسلامی کے کام میں امام ابویوسفؒ جیسے قیاس واجتہاد کے ماہر یحیٰ بن زکریا بن زائدہؒ اور حفص بن غیاثؒ جیسے فن حدیث کے ماہر اور قاسم بن معنؒ جیسے عربی زبان اور لغت کے ماہر شریک کار تھے۔ (جامع المسانید ص۳۳ ج۱)۔

بہرحال تنقیح مسائل اور استخراج احکام کے لئے اجتماعی سعی اور مجالس کے قیام کی نظیریں قرون اولیٰ میں موجود ہیں جو آج بھی ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہیں کہ موجودہ حالات میں اس اہم ترین کام کی ذمہ داری کسی فرد واحد کو نہ سونپ کر ماہرین فن کی ایک مجلس مرتب کریں جو پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر اور شرعی فیصلہ پر پہونچنے کی ذمہ دار ہو۔

واضح رہے کہ تبدیلی جس تیزی کے ساتھ جاری ہے اور مسئلہ جتنا اہم ہے اگر اس قسم کی صلاحیت کے لوگ اپنے سارے ضروری مشاغل چھوڑ کر اور پوری طرح یکسو ہو کر اس کام میں مشغول نہ ہو گئے تو عظیم نقصان کا خطرہ ہے۔

خلاصۂ بحث

(۱) مذکورہ تفصیلی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح اور قانون

سازی کا ماخذ صرف کتاب وسنت ہے اجماع اور قیاس بھی وہی معتبر ہے جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں، کسی انسان یا کسی حکومت کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ کسی چیز کو حلال ٹھہرائے یا حرام قرار دے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب۔ (سورۂ نحل:۱۱۶)

اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے ان کی نسبت یوں مت کہہ دیا کرو کہ فلانی چیز حلال ہے اور فلانی چیز حرام ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگادو گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔

کسی ایسے کام میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق (اللہ) کی نافرمانی ہو

یا

انما الطاعة فی المعروف، اطاعت صرف نیکیوں میں ہے۔

اور

من امرکم بمعصية اللہ تعالیٰ فلا سمع ولا طاعة۔

جو شخص تمہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دے تو اسے نہ سننا ہے اور نہ اس کی اطاعت کرنی ہے۔

اس لئے غیر مسلم حکمرانوں اور لادینی حکومتوں کو تو چھوڑیئے اگر حکمراں مسلمان

بھی ہوں تو انہیں اپنی ذاتی رائے سے کتاب وسنت کو نظر انداز کر کے قانون سازی کا اختیار نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خلفاء راشدین پر جب یہ ظاہر ہوجاتا کہ ان کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے خلاف جارہا ہے تو وہ فوراً اپنی رائے سے رجوع فرماتے اور اپنا حکم منسوخ کرتے تھے۔

> سیدنا عمر بن الخطابؓ کے متعدد واقعات اس کی نظیر میں پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً شوہر کی دیت میں عورت وارث ہوگی یا نہیں؟ اس موقع پر سیدنا عمرؓ نے عدم توریث کا فیصلہ فرمایا لیکن جب حضرت ضحاک بن سفیانؓ نے بتایا کہ اشیم ضبابیؓ کے واقعہ میں آنحضور ﷺ نے عورت کو حصہ دلایا تھا تو حضرت عمرؓ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ (ابوداؤد فی المرأۃ ترث من دیۃ زوجہا، حدیث: ۲۹۲۹)
>
> اسی طرح مجنونہ کو زنا کی وجہ سے رجم کیا جائے گا یا نہیں؟ جب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے آنحضور ﷺ کی یہ حدیث پیش فرمائی کہ آنحضرت ﷺ نے پاگل کو مرفوع القلم قرار دیا ہے تو سیدنا عمرؓ نے اپنا فیصلۂ رجم واپس لے لیا۔ (ابوداؤد کتاب الحدود، حدیث: ۴۳۹۹)

معلوم ہوا کہ حکمراں اگرچہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اسے اصول شرع سے ہٹ کر کوئی حکم دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اور جہاں تک غیر اسلامی حکومت کا سوال ہے وہ دینی امور میں نہ کسی فیصلہ کی مجاز ہے اور نہ اس کا کوئی فیصلہ شرعاً قابل اتباع۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ پرسنل لا جیسے خالص دینی معاملہ میں قانون سازی اور ترمیم وتنسیخ کا حق حکومت کو کس طرح دیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص جب کہ ایسا یقین

کرنے کی متعدد وجوہ ہیں کہ حکومت کا مقصد مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح نہیں بلکہ اس کی پشت پر مختلف سیاسی مصالح ہیں۔

اس لئے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان امور میں نہ خود حکومت کا کوئی فیصلہ قابل قبول ہوگا اور نہ وہ فیصلے قابل قبول ہوں گے جو حکومت نے اپنی سرپرستی میں کرائے ہوں۔

(۲) اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کے بارے میں وہی رائے معتبر ہوگی جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں، اور ہر وہ رائے قابل رد ہوگی جو شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصول اور قرآن وسنت کے قائم کردہ حدود کو توڑ کر قائم کی گئی ہو۔ اور جب بھی رائے کو وحی پر اور خواہش نفس کو عقل پر مقدم کیا جائے گا گمراہی کے دروازے کھلیں گے۔

(۳) اس سے انکار ممکن نہیں کہ جدید سائنسی ترقیات اور ثقافتی انقلاب نے بہت سارے نئے مسائل لا کھڑے کئے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح حالات، زمانے اور عرف کی تبدیلی کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کی روشنی میں کچھ احکام پر ازسرِ نو غور کرنا ہوگا۔ ہر دو قسم کے مسائل میں شارع کے مقاصد، احکام کی روح، اصول وکلیات اور نظائر وامثال کو سامنے رکھنا ہوگا۔

اس کام کی اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ علماء اور اصحاب نظر کی ایک جماعت جلد از جلد تشکیل کی جائے جو دین سے متعلق مختلف ضروری علوم میں مہارت رکھتی ہو۔ اسلامی تاریخ، فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان تاریخی عوامل پر نگاہ رکھتی ہو جو مختلف مراحل میں قانون اسلامی پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ نیز ان کی نگاہ زمانۂ حال اور اس کی ضروریات، عرف عام اور ملک کے تمدنی وثقافتی معاملات پر گہری ہو۔ ایسے لوگ

کتاب وسنت، آثارِ صحابہ، اجماع متقدمین اور اجتہادِ فقہاء کو سامنے رکھ کر پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اور غور وفکر کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔

اس موقعہ پر امام محمد بن حسنؒ کے مندرجہ ذیل ارشاد سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:

من كان عالماً بالكتاب والسنة و بقول اصحاب رسول الله ﷺ و بما استحسن فقهاء المسلمين و سعه ان يجتهد برايه فيما يبتلى به و يقضىٰ به يمضيه فى صلاته و صيامه و حجه و جميع ما امربه و نهىٰ عنه فاذا اجتهد و نظر وقاس على ما اشبه ولم يال وسعه الامر بذلك۔

(اعلام الموقعین ص ٦٦ ج ١)

جو شخص کتاب اللہ، احادیث رسول اللہؐ اقوال صحابہؓ اور مستحسنات فقہائے مسلمین کا عالم ہو، اس کے لئے گنجائش ہے کہ پیش آمدہ مسائل میں وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرے اور اسی کے فیصلے کرے اور اپنی نماز، روزہ، حج اور اوامر ونواہی سے متعلق مسائل میں بھی اسے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کا موقع ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص مذکورہ بالا علم کے ساتھ امثال و نظائر پر پوری بیدار مغزی کے ساتھ قیاس کرے گا تو اس کے لئے اجتہاد کی گنجائش ہونی چاہئے۔

(۴) میں اس امر کو واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلم پرسنل لا کے نام سے جو قانون سرکاری عدالتوں میں آج جاری ہیں ان میں ترمیم کے امکانات بہت محدود

نظر آتے ہیں ممکن ہے کہ جزئیات وتفصیلات میں کچھ ایسے مسائل نکلیں جن پر نئے حالات کی روشنی میں علماء کو کرنا پڑے۔

(۵) اخیر میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مذکورۃ الصدر (۳) کے ذیل میں جس عظیم الشان کام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کے لئے فہم صحیح اور صلاح نیت سب سے ضروری چیز ہے۔ اگر فہم صحیح نہ ہو تو گمراہی کا خطرہ ہے۔ اور نیت درست نہ ہو تو خواہشات نفس کے غلبہ کا جس پر غضب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اور جو لوگ فہم صحیح اور حسن نیت کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے وہی صراطِ مستقیم پر ہوں گے۔

علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں اسلام کے بعد سب سے قیمتی نعمتیں یہی دو ہیں اور ان ہی پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

''بندہ اگر حسن نیت سے نوازا گیا تو مغضوب علیھم کے طریق سے الگ رہے گا، اور اگر اسے صحت فہم بخشی گئی ہے تو وہ ضالین کے طریق سے محفوظ رہے گا۔ جس دل میں اللہ نے صحت فہم کا نور ڈال دیا ہو وہ اس نور کی وجہ سے صحیح وفاسد، حق و باطل اور ہدایت وضلال کے درمیان فرق کر سکے گا۔ اور حسن نیت کی برکت سے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہے گا اور مخلوق کی تعریف سے بے نیاز''۔

ہم اپنے اس مقالہ کو حضرت علامہ ابن قیمؒ کی مندرجہ ذیل عبارت پر ختم کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں وہ صراطِ مستقیم پر چلائے اور فہم صحیح و حسن نیت سے نوازے آمین!

صحة الفهم و حسن القصد من اعظم نعم الله التى انعم بها على عبده بل ما اعطى عبد عطاء بعد الاسلام افضل

ولا اجل منهما بل هما ساقا الاسلام، و قيامه عليهما و بهما يامن العبد طريق المغضوب عليهم الذين فسد قصدهم و طريق الضالين الذين فسدت فهو منهم و يصير من المنعم عليهم الذين حسنت افهامهم و قصورهم وهم اهل الصراط المستقيم الذين امرنا ان نسئل الله ان يهدينا صراطهم فى كل صلاة و صحة الفهم نور يقذفه الله فى قلب العبد يميز به بين الصحيح والفاسد والحق والباطل والهدىٰ والضلال والغى والرشاد و يمده حسن القصد و تحرى الحق و تقوى الرب فى السر والعلانية و يقطع مادته اتباع الهوىٰ و ايثار الدنيا و طلب محمدة الخلق و ترك التقوىٰ ۔

(اعلام الموقعین ص۸۷ ج۱)

فہم صحیح اور حسن نیت اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں میں سے ہے جن سے اللہ نے اپنے بندے کو نوازا ہے، بلکہ اسلام و ایمان کے بعد کسی بندے کو اس سے افضل اور برتر کوئی چیز نہیں دی گئی ہے۔ اور یہ دونوں شجر اسلام کے تنے ہیں کہ ان پر قائم رہنا اور ان کی نگہداشت کرنا بندے کو ان لوگوں کے طریقوں سے محفوظ رکھتا ہے جو غضب الٰہی کا شکار ہوئے۔ اور جن میں فساد نیت پیدا ہو گیا تھا اور ان کے طریقوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے جو گمراہ ہوئے، اور جن کی عقلیں فاسد ہو گئی تھیں۔ اور وہ ان لوگوں میں سے ہو جائے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا اور جن کی عقلیں اور جن کی نیتیں

اچھی تھیں۔ اور وہی لوگ سیدھی راہ والے ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دعا ہر نماز میں کریں کہ وہ ان کی راہ پر چلائے، اور فہم صحیح درحقیقت ایک نور ہے جسے اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں ڈال دیتا ہے اور پھر وہ اسی کے ذریعہ صحیح و غلط، حق و باطل اور ہدایات و گمراہی میں تمیز کرتا ہے اور حسن نیت، تلاش حق اور خوف خدا کھلے عام اور پوشیدہ طور پر اس کی مدد کرتے ہیں اور خواہشات نفس کی پیروی اور مخلوق کی تعریف کی طلب و تمنا اور ترک تقویٰ سے ان کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

منت اللہ رحمانی

خانقاہ رحمانی، مونگیر

جولائی ۱۹۶۹ء